ماضی میں مصلحین اسلام کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے بعض امور کو تحقیق و تجزیے سے بالاتر قرار دے رکھا تھا جس پر کسی گفتگو کا دروازہ کھولنا ممنوع سمجھا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر اتحاد امت کے تمام علمبردار اپنے اپنے فقہی دائرۂ کار کے اندر ہی فکری و عملی سرگرمیوں کو روا سمجھتے تھے۔ ائمہ فقہا اور ائمہ محدثین کی عقل و دانش اور ان کے علمی کاموں کو منزل من اللہ کا درجہ حاصل تھا۔

دنیا بھر کے اہل ایمان سوالی ہیں

آخر کب آئے گی خدا کی مدد؟

مسلمان جو منصب سیادت سے اپنی معزولی کے باوجود اب بھی خود کو خیر امت سمجھتے ہیں، اپنے بارے میں طرح طرح کی خطرناک خوش گمانیوں میں مبتلا ہیں۔ صدیوں سے جو قوم اپنے اقوال و اعمال سے شب و روز اس بات اعلان کر رہی کہ ؎

رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی

جذباتی طور پر اب تک وہ اس بات کو تسلیم کرنے کیلئے آمادہ نہیں کہ جس امت پر مشکل گھڑی میں آسمان سے فرشتوں کے نزول کا وعدہ ہے بدقسمتی سے موجودہ مسلمان اب وہ امت نہیں رہے۔ خوب صورت نعتوں کی دلکش آوازوں، سیرت کے جلسہ و جلوس، عبادات کے اجتماعی مظاہرے خواہ ہمیں ہمارے اہل ایمان بنے رہنے پر کتنا ہی یقین کیوں نہ دلائیں، واقعہ یہ ہے کہ ہم اب وہ کچھ نہیں رہے جنہیں ﴿محمد رسول اللہ والذین معہ﴾ کی جماعت کا نام دیا جا سکے۔ پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ صدیاں گزریں جب کبھی ہم سیادت عالم کے منصب پر فائز تھے، ہمارا ملی وجود خیر امت سے عبارت تھا، آخری نبی کی امت کی حیثیت سے تاریخ کے آخری لمحے تک دنیا کی سیادت ہمارے نام لکھ دی گئی تھی۔ سیادت کا یہ منصب ہمیں وحی محمدی کی وجہ سے عطا ہوا تھا۔

وحی کی تجلی جب تک ہماری راہوں کو منور کرتی رہی ہم تاریخ کی لگام سنبھالے رہے۔ دنیا میں واقعات کا رخ ہماری مرضی سے متعین ہوتا تھا اور جب کبھی دشوار لمحات میں ہمیں واقعات پر اپنی گرفت ڈھیلی محسوس ہوتی تو بے ساختہ ہماری نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ جاتیں۔ ہم خدائے قادر مطلق سے اضافی مدد کے طالب ہوتے اور عین پریشان کن لمحات میں حیرت انگیز طور پر اپنے خدا کی نصرت کو موجود پاتے۔ بدر کے معرکے میں تو خود ذات ختمی رسالت موجود تھی جس نے مٹھی بھر اہل ایمان کی نصرت کے لئے رب ذوالجلال کی نصرت چاہی تھی لیکن اہل ایمان کے بعد کے معرکے بھی خواہ وہ ایران و روما کی سلطنتوں کا سرنگوں ہونا ہو یا بعد کے عہد میں اسپین کے ساحل پر کشتیاں جلانے کا واقعہ، ان تمام لمحات میں مسلمانوں کو ہمیشہ یہ محسوس ہوتا رہا کہ ایک زندہ اور متحرک

خدا ان کی نصرت کیلئے ہمہ وقت موجود ہے، جس کے بل بوتے پر وہ بڑی سے بڑی مہم جوئی کا خطرہ مول لے سکتے ہیں۔ معروف ایرانی فوجی جرنیل ہرمزان جب گرفتار ہو کر حضرت عمرؓ کے سامنے آیا تھا تو اس نے اسی بات کی شہادت دی تھی۔ اس نے کہا اے عمر! جب تک قوت کا قوت سے مقابلہ تھا تم ہمارے مقابلے میں کسی شمار و قطار میں نہ تھے لیکن آج خدا تمہاری طرف ہے اور خدا جس کی طرف ہو اس پر کون غالب آ سکتا ہے؟

اس میں شبہ نہیں کہ ہم ہی وہ لوگ ہیں جو کل خدا کی نصرت کے بھروسے سے بڑی سے بڑی معرکہ آرائی سر کیا کرتے تھے۔ لیکن اب آخر کیا بات ہے، صدیاں گزریں ہم نصرت خداوندی کی اس لذت سے نا آشنا ہیں۔ دین کے لئے مرنے مٹنے والوں کی آج بھی کمی نہیں۔ دنیا کے مختلف خطوں میں حزب اللہ، جنداللہ، اسلامی جہاد، جماعت اسلامیہ، مجاہدین اسلام، سپاہ صحابہ، فوج محمدی اور نہ جانے کن کن ناموں سے اسلام کے لئے جان دینے والے موجود ہیں۔ دنیا کا کون سا خطہ ہے جہاں محمدؐ کے نام لیواؤں نے اپنے خون سے عزیمت کی داستان نہ لکھی ہو۔ لیکن اب ہر چھوٹے بڑے معرکہ میں صاف محسوس ہوتا ہے جیسے شکست ہمارا مقدر بن گئی ہو۔ خدا جو آج بھی قادر مطلق ہے اور جو چشم زدن میں حالات کا رخ پھیر سکتا ہے مسلمانوں کی مدد کو نہیں آتا۔ حالانکہ گریہ وزاری کی محفلیں سب سے زیادہ اسی قومِ مسلم کے درمیان سجائی جاتی ہیں، نالے سب سے زیادہ یہیں بلند ہوتے ہیں اور کیوں نہ ہو جب صدیوں سے یہ امت آگ و خون کے سمندر میں غوطے لگا رہی ہو، جب اس پر لمحہ لمحہ عذاب کر دیا گیا ہو اور جب ہر سو ایک قیامت انگیز کہرام بپا ہو۔ محشر کی اس گھڑی میں آخر پکارنے والے کسے پکاریں؟ مسجدیں اب پہلے سے کہیں زیادہ آباد ہیں۔ اصلاحی اور تبلیغی تحریکوں نے نماز و روزے، شب بیداری اور مراقبہ کا وافر ماحول تیار کر دیا ہے۔ سنن و نوافل پڑھنے والوں اور شب و روز اوراد و وظائف پڑھنے والوں کی بھی کمی نہیں۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ امت کے اس عمومی اضطراب اور بے بسی کے باوجود خدائے واحد کی توجہ ہماری طرف نہیں ہوتی؟

یہ وہ سوال ہے جس نے ہر خاص و عام کو مضطرب کر رکھا ہے۔ بڑے بڑے ذہنوں پر کنفیوژن کی آندھیاں چل رہی ہیں۔ چند سال پہلے افغانستان پر امریکی حملے کے دوران جب افغانیوں نے غیرت کا سودا کرنے سے انکار کر دیا اور جس کے نتیجے میں انہیں امریکی افواج کی جارحیت کا سامنا کرنا پڑا، آسمان سے B-52 طیارے موت برسانے لگے، ان چند ہفتوں میں شاید ہی کوئی گیا گزرا مسلمان بھی ہو جس نے رو رو کر بارگاہِ خداوندی میں دعائیں نہ مانگی ہوں۔ کیا مشرق کیا مغرب، کیا شیعہ کیا سنی، پوری مسلم دنیا بیک آواز چیخ اٹھی: بارالہا! اس مجبور و بے بس امت کی خبر گیری کر۔ مسجدیں قنوت نازلہ کی آہ و بکا سے گونج اٹھیں۔ حتی کہ ان مسلمانوں نے بھی جنہوں نے کبھی مسجد کا رخ نہیں کیا تھا، اپنی پیشانیوں سے سجدہ گاہوں کو آباد کر ڈالا۔ افغانیوں نے کمال استقامت کا مظاہرہ کیا۔ آسمان سے برستی مسلسل موت بھی ان کے پایہ استقامت کو نہ ڈگمگا سکی۔ تب پوری دنیا کو ایسا لگتا تھا

گویا کوئی معجزہ ہونے کو ہے۔ ایّام ہفتوں میں بدلتے گئے، کوئی معجزہ تو کیا ہوتا، ہاں مسلمانوں کی شکست نمایاں ہونے لگی۔ افغانستان میں جو کچھ ہوا اس نے اہل ایمان کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ خداوند وہاں بھی مسلمانوں کی مدد کو نہیں آیا۔ امت ایک گہری مایوسی میں ڈوب گئی۔ ۱۲۵۸ء میں سقوط بغداد کے بعد مسلمانوں کی تاریخ میں یہ دوسرا واقعہ تھا جب ان کا جذباتی وجود کا ملاً ڈھہ کر رہ گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے اب کوئی نئی صبح اس امت کی زندگی میں کبھی نہ آئے گی۔

ہم من حیث القوم تاریخ کے ہر نازک لمحے میں ﴿نصر من الله وفتح قريب﴾ کا علم بلند کرتے رہے ہیں۔ ہم نے اپنی بساط بھر حالات کا مقابلہ کرنے اور اسے بدل ڈالنے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ لیکن نصرت الٰہی کی لذت سے ہمارے حواس نا آشنا رہے۔ پچھلے دنوں عراق میں امریکی ٹینکوں کی پیش قدمی کے دوران جب تیز ریگستانی آندھی اٹھنے لگی تھی تو ہم مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ایسا لگا گویا اب خدا کی مدد آ پہنچی ہے مگر جلد ہی خوش فہمیوں کے ان غباروں سے بھی ہوا نکل گئی۔ سقوط بغداد نے ایک بار پھر اس تلخ حقیقت سے پردہ اٹھا دیا کہ خدا اب ہماری طرف نہیں ہے اور جب تک کسی امت کو تائید غیبی حاصل نہ ہو، خدا کی پشت پناہی کے بغیر شکست اس کا مقدر ہے، صدیاں گزریں ہم ہر روز ایک نئے سقوط سے دوچار ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے ہر لمحہ ہمارے اندرون میں کچھ ڈھہ رہا ہے۔ ہمارا مجموعی وجود اس صورتِ حال پر سخت مضطرب ہے۔ آخر کب آئے گی خدا کی مدد؟

ہمارے فقہاء و مفسرین اس سوال کا صحیح تجزیہ کرنے اور اس کا مدلل جواب فراہم کرنے کے بجائے قرآنی آیات کی غلط تاویل کے ذریعے ہمیں مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے بقول یہ ساری مصیبتیں دراصل اہل ایمان کی حیثیت سے ہماری آزمائش ہیں ﴿ام حسبتم ان تدخلوا الجنة ولمّا يأتكم مثل الذين خلوا من قبلكم مستهم البأساء والضراء وزلزلوا حتى يقول الرسول و الذين ءامنوا معه متىٰ نصرالله ألا إن نصرالله قريب﴾ (البقرة: ۲۱٤) کا مطلب انہوں نے یہی سمجھا ہے کہ دنیا تو ہے ہی مسلمانوں کے لئے مصائب و آلام کی جگہ۔ یہاں کافروں کی چاندنی ہے۔ مسلمانوں کیلئے چونکہ آخرت کی ضمانت ہے اس لئے انہیں دنیا میں ان دل گرفتہ حالات پر صبر و سکون سے کام لینا چاہیے۔ بعض گروہوں نے صورت حال کی شدت سے تنگ آ کر ترک دنیا کو باقاعدہ مذہبی رویے کی حیثیت دے رکھی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے ترک دنیا ممکن نہیں۔ جہاں شب و روز ہمارا وجود انہدام کا شکار ہو، ہم میں سے کتنے لوگ غور و فکر سے منہ موڑ کر شتر گربگی اختیار کر سکتے ہیں اور کب تک؟ پھر قصہ یہ ہے کہ ذلت کی یہ زندگی اور پے در پے شکستوں کا یہ عذاب ہماری اس تاریخ سے میل نہیں کھاتا جس میں مسلمانوں کی وہ نسل رہتی تھی جس کی مسلمانیت اور اطاعت گزاری پر ہم آج بھی عش عش کرتے ہیں اور جنہیں ہم اپنی زندگی میں رول ماڈل کے طور پر برتنے کے متمنی ہیں۔ بھلا محمدؐ رسول اللہ اور انکے اصحاب سے بڑا مسلمان اور کون ہوگا۔ ان پر نازک لمحات ضرور آئے لیکن ذلت کی زندگی اور شکستوں کے عذابِ مسلسل سے انہیں واسطہ نہ پڑا۔ ہماری تاریخ تو ہمیں یہ بتاتی

ہے کہ اہل ایمان کے لئے دنیا میں بھی سرفرازی کا وعدہ ہے اور آخرت تو ان کے لئے ہے ہی محفوظ۔ قرآن کے صفحات اسی بات پر گواہ ہیں کہ تاریخ کے ہر دور میں اہل ایمان کو آخرت کی بشارت کے ساتھ ساتھ دنیا کی سیادت بھی عطا کی گئی۔ داؤد وسلیمان کی پر شکوہ سلطنت کے تذکرے اور بنی اسرائیل کو تمام عالم پر فضیلت عطا کرنے کی باتیں ہمیں یہی تو بتاتی ہیں کہ ہم خدا کی پارٹی میں آ گئے تو دنیا ہماری مٹھی میں آ جاتی ہے کہ ایسا پہلے بھی ہوا ہے اور اسی کی بشارت قرآن مجید میں موجود ہے۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ صدیاں گزریں، ہر مشکل مرحلے میں ''الا ان نصر اللہ قریب'' کی بشارت کسی فیصلہ کن مرحلے سے پہلے ہی دم توڑ دیتی ہے اور ہماری جدوجہد نصرت الٰہی سے محروم ایک نئی داستانِ عبرت پر ختم ہو جاتی ہے۔ واقعات تو یہی بتاتے ہیں کہ خدا جس قوم کی مدد کو آئے، جس کا رفیق ومعاون بن جائے وہ اب ہم نہیں۔

زوال کی صدیوں میں ہمارے ہاں ایک اہل فکر شاعر پیدا ہوا جس نے خدا کے دست شفقت اٹھائے لینے پر شکایات کا انبار لگا دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس شوخ وشنگ شاعر کی شکایت حقیقت واقعہ تھی۔

رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

البتہ اس صورت حال کے مداوا کیلئے شاعر نے جو جواب تلاش کیا وہ اتنا ہی روایتی تھا جسے مختلف قالب میں ہمارے علماء سابقین پیش کرتے آئے ہیں۔ صبح کی بیداری، خدا کی دلداری، اس تک پلٹنے کی باتیں فی نفسہٖ ان جوابات کی صحت پر کسے شبہ ہو سکتا ہے۔ البتہ ان صحیح جوابوں کی موجودگی کے باوجود اگر ہمارا ملی قافلہ نصرت الٰہی کے حصول میں ناکام رہا تو اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہم رجوع الی اللہ کو عرصے سے بعض رسوم عبادات میں دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اس لئے رجوع الی اللہ کی ہماری تمام تر کوشش بھی ہمیں خدا کی مدد کا مستحق نہیں بناتی۔ نصرت کا قرآنی وعدہ ہم سے بہت دور رہ جاتا ہے۔ پھر فطری طور پر مضطرب دل ودماغ میں یہ اندیشے جنم لیتے ہیں آیا خدا ہے بھی یا نہیں؟ کہاں ہے وہ خدا جس نے مؤمنوں کی مدد کا وعدہ کر رکھا ہے۔

جب واقعات مسلسل اس بات کی شہادت دے رہے ہوں کہ خدا نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا ہے تو ہم نصرتِ الٰہی کے بھروسے جینے والے لوگوں کے لئے لازم ہے کہ اس سوال کا فی الفور جواب فراہم کریں اولاً ایسا کیوں ہوا اور ثانیاً یہ کہ دوبارہ نصرت خداوندی کا سزاوار بننے کیلئے ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ گویا من حیث القوم ہمیں اپنے اجتماعی وجود کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ جب تک ہم اپنے حال پر سوالیہ نشان نہیں لگاتے، مستقبل کیلئے راستہ ملنا ممکن نہیں۔

پہلی بات تو یہ سمجھ لینے کی ہے کہ ہم خواہ محمد رسول اللہ سے اپنا کتنا ہی تعلق کیوں نہ بتائیں واقعہ یہ ہے کہ فکری اور عملی طور پر ہم اصحابِ رسول کی جماعت سے بس واجبی سی نسبت رکھتے ہیں۔ وہ جس اسلام کے پیروکار تھے وہ کچھ اور تھا۔ ان کی جگمگاتی زندگی

قرآن مجید کے صفحات میں جھلکتی تھی۔ ہم نے اپنی مذہبی زندگی کی تعمیر میں قرآن کے بجائے بھانت بھانت کی خودساختہ کتابوں کو اپنا معاون بنا رکھا ہے۔ وہ عبودیت کی لذت سے آشنا تھے، ہم رسومِ عبودیت میں پھنس کر رہ گئے ہیں۔ وہ خیرامت تھے جن کی ہاتھوں میں تاریخ کی لگام تھمائی گئی تھی۔ ہم خیرامت کی خوش گمانیوں میں مبتلا عملی طور پر اس منصب سے معزول تاریخ کے قیدی بن کر رہ گئے ہیں۔ ہمارا حال اہل یہود سے کچھ مختلف نہیں جو اپنی معزولی کے باوجود آج بھی خود کو Chosen People سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ جن کے ہاں دین داری نام ہے رسومِ دین داری کا اور چونکہ خالی خولی رسوم وہ نتائج پیدا نہیں کر سکتے جو زندہ دین داری پیدا کر سکتی ہے، اسلئے مذہب کی طرف ہماری تمام تر واپسی کے باوجود مطلوبہ نتائج پیدا نہیں ہوتے۔ آج اس امت میں ارکانِ اسلام پر عامل شب بیدار مسلمانوں کی کمی نہیں۔ مابعد استعمار عہد میں مسجدیں کہیں زیادہ آباد ہیں۔ مدارس کی تعداد روز افزوں اضافے پر ہے۔ مسلمان نوجوانوں میں دین کی طرف واپسی دنیا بھر میں ایک محسوس عمل کی حیثیت سے واشگاف ہے۔ پھر بھی یہ رسومِ دین داری ہمیں نصرت خداوندی کا حقدار نہیں بناتی اور خدا ہماری مدد کو نہیں آتا تو یہ بات غور کرنے کی ہے کہ ہم جسے دین داری سمجھ بیٹھے ہیں یہ سب کچھ اللہ کو واقعی مطلوب ہے بھی یا نہیں۔

نصرت خداوندی کے غیاب میں ہماری آہ و بکا کو بہتر طور پر سمجھنے کیلئے اہل یہود کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ایسا اس لئے بھی کہ قرآن مجید بار بار انحراف یہود کے حوالے سے ہمیں بے جان رسومِ عبودیت سے متنبہ کرتا ہے۔ اہل یہود جنہیں ہم مسلمان مغضوب الغضب اور راندۂ درگاہ قوم کی حیثیت سے جانتے ہیں، انکی مذہبیت کا یہ عالم ہے کہ وہ زندگی کے ہر معاملے میں باریک سے باریک تفصیل بھی اپنے ربائیوں اور فقہاء سے معلوم کرنا لازم خیال کرتے ہیں۔ یومِ کافور کی تفصیلات ہوں یا آدابِ سبت، یا حلالِ ذبیحہ کا معاملہ، مذہبی یہودی جس باریک بینی کے ساتھ تلمودی رسوم کو انجام دینا ضروری سمجھتا ہے اسے دیکھ کر تو دوسروں کو بھی یہ لگتا ہے کہ اس سرزمین پر شاید ہی کوئی گروہ ایسا ہو جو اپنی زندگی میں مذہب پر اس قدر عامل ہو۔ اہل یہود آج بھی یہ سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کی منتخب قوم ہیں جنہیں اللہ نے اقوام عالم پر فضیلت دی ہے چونکہ وہ حامل تورات ہیں اور یہ وہ منصب ہے جس کے حوالے سے وہ خدا کے چہیتے ہیں۔ پھر بھلا خدا ان کی خبر گیری نہ کرے تو کس کی کرے گا۔ نازی جرمنی میں یہودیوں کے خلاف جب عمومی نفرت کا لاوا پھوٹ پڑا اور خدا کے ان خودساختہ چہیتوں پر جب خدا کی زمین تنگ ہونے لگی تو مذہبی یہودی دانشور پکار اٹھے کہ آخر خدا اپنے چہیتوں کو اس طرح ختم ہوتے ہوئے کیسے دیکھ سکتا ہے۔ کسی نے کہا تورات کے الفاظ میں قوتوں کا پوشیدہ خزانہ موجود ہے۔ اگر مخصوص آیات کی مسلسل تلاوت کی جائے تو حالات بدل سکتے ہیں۔ کسی نے قبالائی نقوش کا سہارا لیا، کسی نے ربائی ادب سے اپنا تعلق جوڑا اور کسی نے اجتماعی ذکر و مراقبے کی مجلسیں آباد کر ڈالیں۔ جوں جوں جرمنی اور اس سے متعلقہ علاقوں میں اہل یہود پر زمین تنگ ہوتی گئی، ان کی مذہبی زندگی کا احیاء نمایاں ہونے لگا۔ حتی کہ عقوبت گاہوں اور (concentration

(camps میں یہ منظر دیکھنے کو ملا کہ کوئی کھڑے کھڑے کسی ذکر میں مشغول ہے تو کوئی زیر لب کسی ورد میں مصروف۔ حتیٰ کہ ان کیمپوں میں جہاں کھانے کیلئے روٹی کے چند نوالے اور جسم پر ڈھنگ کا لباس نہ رہ گیا تھا، وہاں بھی یہودیوں نے محافظوں کو رشوت دے کر اگر کچھ حاصل کرنا ضروری سمجھا تو وہ دعاؤں کی کتابیں Siddur تھیں جن پر وہ اجتماعی اور انفرادی طور پر عمل پیرا تھے۔ یہ مذہبی کتابیں جب تلاشی کے دوران ضبط کر لی جاتیں اور انہیں یہودیوں کی نگاہوں کے سامنے نذرِ آتش کر دیا جاتا تو مذہبی یہودی پکار اٹھتے کہ کیا ان وظائف کی کتابوں کے بغیر دنیا باقی رہ سکے گی؟ بعض یہودی زاہد، یہ سمجھتے تھے کہ اگر تورات کے بعض حصوں کو استغراق کے ساتھ مسلسل پڑھا جائے اور پھر خدا سے نصرت کی طلب کی جائے تو اس کی مدد کا آنا یقینی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک عقوبت گاہ میں بالآخر ایک ایسے زاہد کو ایک خندق میں، جہاں مردے پھینک دیے جاتے تھے، ایک گوشۂ عافیت مل گیا۔ وہ مسلسل وہاں اوراد و وظائف میں مشغول رہا۔ یہاں تک کہ اس خندق کا نام لوگوں نے بیت مدراش رکھ دیا۔ لیکن ان مسلسل دعاؤں اور سخت مجاہدے کے باوجود خدا ان کی مدد کو نہ آیا۔

رسومِ عبودیت کی اس سے بڑی مثال کیا ہوگی کہ اہل یہود نے ان سخت حالات میں بھی مذہبی زندگی کے ارکان پر عامل رہنے کی بھرپور کوشش کی۔ کہیں سے ایک ٹفلن کا جوڑا مل جاتا یا نمازی شال (tillet) ہاتھ لگ جاتی تو ان کی مایوس زندگی میں مسرت کی ایک لہر دوڑ جاتی۔ باری باری سے وہ ٹفلن لگا کر عبادت کرتے۔ حتیٰ کہ ایک کیمپ سے دوسرے کیمپ تک پیدل مارچ میں بھی وہ اس بات کا اہتمام کرتے کہ ان میں کوئی تلمود کا عالم ہو تو وہ فقہ یہود کا درس جاری رکھے۔ عقوبت گاہوں میں جب بھی محافظوں کی آمد و رفت کم ہوتی، یہودی اجتماعی طور پر ان لوگوں سے تورات و مشنات کا زبانی درس سنتے، جو اپنے حافظے میں ان مذہبی کتب کو محفوظ رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ Maidanek کے کیمپ میں جہاں تین ہزار یہودی رکھے گئے تھے، ان میں بہت کم ایسے لوگ تھے جو روزِ اجتماعی عبادت میں شریک نہ ہوتے ہوں، کوڑے کے ایک ڈھیر پر جب ایک دن تلمود کا صفحہ کسی کو نظر آ گیا تو ان قیدیوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اسی کیمپ میں موجود ربائی اسحاق ذنبہ تلمود کے اس صفحہ کا باقاعدہ درس دیتے۔ گو کہ ان کیمپوں میں ان کی مذہبی کتابیں ضبط کر لی جاتی تھیں، لیکن ان کی مذہب سے وابستگی کا یہ عالم تھا کہ ان لوگوں نے مختلف چیزوں کو جن کاغذات میں لپیٹ رکھا تھا وہ تلمود کے صفحات ہی تھے جو لوگ کھانے کے چند نوالوں کے لئے مدت سے ترسائے گئے ہوں ان کی مذہب سے وابستگی کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی موقع ہاتھ آتا تو وہ محافظوں سے اپنے کھانے کے بدلے یا اپنے دانتوں میں لگے سونے کے بدلے تورات کا کوئی نسخہ، وظیفہ کی کوئی کتاب، Siddur کا کوئی ایڈیشن خرید لیتے۔ اتنی سخت مذہبیت کے باوجود ان کی چیخ و پکار رائیگاں گئی۔ خدا کے یہ خود ساختہ چہیتے رسوم بندگی کے ان تمام مظاہروں کے باوجود اس کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

جرمنی کی مختلف عقوبت گاہوں بالخصوص Auschwitz میں اہل یہود پر جو گزری اس سے پوری قومِ یہود دہل گئی۔ کہتے ہیں کہ یورپ کی دو تہائی یہودی آبادی نازیوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتار دی گئی۔ یہ سب کچھ چشم زدن میں نہیں ہو گیا۔عقوبت گاہوں کی کہانیاں اور موت گاہوں کے لرزہ انگیز مناظر جب عام ہوتے گئے اور یورپ کے یہودیوں کو صاف محسوس ہونے لگا کہ ان کا من حیث القوم خاتمہ اب چند دنوں کی بات ہے۔ وہ مسلسل اپنے آپ سے پوچھا کیے، کیا خدا ہم چہیتوں سے اپنی دنیا خالی کر لے گا؟ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم جو تورات کے حاملین ہیں، ہم جو لمحہ لمحہ تلمود پر عمل پیرا ہیں، ان کے وجود سے دنیا خالی ہوتی ہوئی نظر آئے اور پھر بھی خدا کی رحمت کو جوش نہ آئے۔بعض دلوں میں یہ شکوک بھی جنم لیتے آیا خدا ہے بھی یا نہیں؟ بنو اسرائیل کی عظمت کا فسانہ جواب تک سنا کیے تھے، یہ سب خواب وخیال کی باتیں تو نہیں؟

سچ پوچھئے تو Auschwitz نے اہل یہود کی مذہبی فکر کو ایک بحران سے دوچار کر دیا۔لیکن تب بھی مقدس ماضی میں جینے والی یہ قوم اپنی مذہبی زندگی کے احتساب پر آمادہ نہ ہوئی۔ یہ پہلا واقعہ نہیں تھا جب یہود کسی بڑے حادثے سے دوچار ہوئے ہوں، حضرت مسیح کی آمد کے بعد ہیکل سلیمانی کی دوبارہ تباہی اور تب سے اب تک ان کی ملی زندگی ایک عذاب مسلسل سے عبارت رہی ہے۔ وہ جہاں بھی گئے وہاں ذلت کے عذاب میں مبتلا رہے۔ابھی ان کے قدم جمنے بھی نہ پاتے کہ وہ ان علاقوں سے ذلت کا عذاب لیے نکلنے پر مجبور ہوتے۔ صاف محسوس ہوتا کہ جب خدا کسی قوم سے اپنا دست شفقت اٹھالے تو پھر اسے جہاں میں کہیں امان نہیں ملتی۔ان کے اندر علماء ودانشور، اہل حرفت اور عقل وخرد رکھنے والوں کی کمی نہ تھی۔ وہ زبردست محنت کے عادی تھے۔ دل ودماغ کی فطری صلاحیتوں میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہ تھے۔ دنیا کمانے اور اس کے استعمال کا بھی انہیں خوب فن آتا تھا لیکن جب خدا ہی اپنا دستِ کرم اٹھالے تو یہ بہترین انسانی صلاحیتیں بھی کام نہیں آتیں۔لیکن افسوس کہ ان کے ذہین ترین افراد بھی دیوار پر لکھی اس واضح تحریر کو پڑھنے میں ناکام رہے۔خود کو داؤد سلیمان کی سلطنت کا وارث سمجھنے والے اہل یہود آج بھی اس خام خیالی میں مبتلا ہیں کہ وہ خدا کے برگزیدہ بندے ہیں جن کے بغیر تاریخ کا سفر بے معنی ہے بلکہ معاصر تاریخ میں قیام اسرائیل کے بعد ۱۹۶۷ء کی چھ روزہ جنگ میں خوابیدہ عربوں کے طفیل انہیں جو غیر معمولی کامیابی ملی اس سے وہ اس بات کی سند لاتے ہیں خدا دوبارہ ان کی پشت پر موجود ہے۔ حالانکہ ان کے خدا ترس علماء ہانکے پکارے یہ کہہ رہے ہیں کہ ریاست اسرائیل کا وجود تلمودی فقہ سے ہم آہنگ نہیں اور نہ ہی اس ریاست میں تورات کی تعلیمات کا شائبہ بھی پایا جاتا ہے۔ جو ریاست دجل وفریب، ظلم وبربریت سے غذا حاصل کرتی ہو، جہاں تورات کی تعلیمات ریاست کی مصلحتوں میں دفن کر دی جاتی ہو، بھلا ایک ایسی غیر توراتی ریاست کی پشت پر خدا کیسے ہو سکتا ہے؟ ماضی میں جینے والی قوم اپنے محاسبے پر آمادہ نہیں ہوتی، اس کی ساری کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ صورت حال کی کوئی ایسی تاویل کر لے جو اسے خود احتسابی سے بچا سکے۔

کھلی آنکھوں اور بیدار دل و دماغ سے دیکھا جائے تو ہم مسلمانوں کا معاملہ بھی کچھ مختلف نہیں۔ بدقسمتی سے ہم بھی تاویلات کے خوگر ہو چکے ہیں۔ ہم اپنی پے در پے ناکامیوں کا احتساب کرنے کے بجائے ایسی تاویلات سے دل بہلانا مناسب سمجھتے ہیں جس سے ہماری تکلیف دہ صورت حال پر پردہ پڑا رہ سکے۔

تاریخ کے اس نازک مرحلے میں اگر ہم بھی اہل یہود کی طرح اپنی خودساختہ تاویلات پر مصر رہے تو ہمارا انجام بھی ان سے مختلف نہیں ہوسکتا کہ خدا کے نزدیک اہل یہود ہوں یا ہم مسلمان ہماری فوقیت کا بنیادی سبب تمسک بالکتاب تھا۔ اہل یہود جب تک تورات کو تھامے رہے، چہار دانگ عالم پر ان کی فضیلت قائم رہی۔ لیکن جب انہوں نے تورات کے گرد احبار و رہبان کی خود ساختہ تاویلات کے پہرے بٹھا دیئے اور جب ان کی مذہبی زندگی میں وحیِ تورات کے بجائے احبار و رہبان کی فقہ، مشناۃ و گمارا کے مجموعوں اور ملفوظات و وظائف پر مشتمل کتابوں کو کلیدی اہمیت حاصل ہوتی گئی تو ان کا تعلق وحیِ ربانی سے ٹوٹ گیا۔ انسانی تشریح و تعبیر میں باقی ماندہ تورات کو انہوں نے جس طرح محصور کر دیا اس کے نتیجے میں عبودیت کا چراغ گل ہونا یقینی تھا۔ بندگی غائب ہوگئی۔ رسومِ بندگی ان کا سرمایہ قرار پایا۔ ان رسوم کی ادائیگی میں وہ اتنے پختہ ہوئے کہ انہوں نے معمولی باتوں پر فقہ کی ضخیم مجلدات مرتب کر ڈالیں۔ ربائی تاویلات نے اہل یہود کی مذہبی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ ان کے علماء و فقہاء یہاں تک کہنے لگے کہ خدا نے جب ایک بار تورات ہمارے حوالے کر دیا ہے تو اب اس کی تشریح و تعبیر کا کلی حق بھی ہمیں ہی حاصل ہے۔ موسیٰؑ کے مقابلے میں ربائی اکیوا تورات کے کہیں زیادہ مستند شارح سمجھے گئے۔ فقہاء کا تعمیر کردہ یہ دین آج بلاتکلف ربائی یہودیت سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کہنے کو تو یہ دین موسوی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ باقی ماندہ تورات سے بھی اس کا رشتہ بس واجبی سا ہے۔ فقہائے یہود کا تعمیر کردہ یہ دین وہ نتائج پیدا نہیں کر سکتا جو دینِ موسوی کا خاصہ رہا ہے۔ دین فقہاء اور دینِ وحی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جہاں وحی فرد کے دل و دماغ سے عبودیت کاملہ کا آبشار بہانا چاہتی ہے وہیں فقہاء کی باریک بینی مظاہر پرستی کا ایک ایسا دفتر مرتب کرتی ہے جس پر عبودیت کا صرف گمان ہوتا ہے۔ وحی تاریخ کا راز افشا کرتی اور اپنے حاملین کو تاریخ کی شاہِ کلید عطا کر دیتی ہے۔ جب کہ فقہاء و ربائی اپنی احتیاط پسندی میں مطالب وحی کی ایک ایسی طویل فہرست ایجاد کر ڈالتے ہیں جن کی تفصیلات میں بسا اوقات خود غایت وحی دم توڑ دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ احبار و رہبان پر غیر ضروری انحصار پوری قوم کو وحی کی تجلی سے دور کر دیتی ہے اور مذہبی زندگی کی مشین انسانوں کی مرتب کردہ تعبیر و تشریح کی مرہون منت ہو کر رہ جاتی ہے۔ اہل یہود پر جو گزری سو گزری۔ ان کے اس دردناک انجام میں ہمارے لئے بڑا سبق ہے۔ آنکھیں اگر کھلی ہوں تو اہل یہود سے متعلق عبرت ناک بیانات میں، جس سے قرآن کے صفحات پُر ہیں، ہم اس سوال کا جواب بآسانی تلاش کر سکتے ہیں کہ ہم کیوں معزول ہوئے اور آخر کیوں خدا نے ہمارے اوپر سے اپنا دست شفقت اٹھا لیا ہے۔

دینِ فقہاء اور دینِ وحی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جہاں وحی فرد کے دل و دماغ سے عبودیت کاملہ کا آبشار بہانا چاہتی ہے وہیں فقہاء کی باریک بینی مظاہر پرستی کا ایک ایسا دفتر مرتب کرتی ہے جس پر عبودیت کا صرف گمان ہوتا ہے۔ وحی تاریخ کا راز افشا کرتی اور اپنے حاملین کو تاریخ کی شاہِ کلید عطا کر دیتی ہے۔ جب کہ فقہاء ور بائی اپنی احتیاط پسندی میں مطالب وحی کی ایک ایسی طویل فہرست ایجاد کر ڈالتے ہیں جن کی تفصیلات میں بسا اوقات خود غایت وحی دم توڑ دیتا ہے۔